سیلابِ بلا

نعیم صدیقی

ہماری کشتی سیلابِ عذاب میں ڈانواں ڈول ہوتی ہوئی گذر رہی ہے - خطرۂ غرقابی کسی نگر مچھ کے دہن یا کسی بھنور کی آنکھ کی طرح اس کشتی کو ہدف بنائے ہوئے ہے[1] -

شمالی جانب بیرونی دشمنوں کی بمباریاں، راولپنڈی اسلام آباد میں اوجھڑی ڈپو کی تباہی، پنجاب میں سیلاب کی تند لہروں کا انسانی زندگیوں اور اسبابِ تمدن کو جھاڑو کی طرح بہالے جانا، سندھ اور کراچی میں نقاب پوش اور بے نقاب تباہ کاروں کی ایسی یورشیں کہ انسانوں اور جائیدادوں اور ذرائع و وسائل کی مکمل غارت گری، غیر ملکی مداخلت کاروں کا کئی اطراف سے ٹوٹ پڑنا، ملک بھر میں مہلک سازشوں کے جالوں کا پھیلاؤ، چھ چھ ماہ کے بچوں کی خونریزی، مادریت اور نسائیت اور بزرگی کی بے توقیری ادھر سیاست کے جوڑ توڑ، قانونی اور غیر قانونی چالبازیاں، کہیں علمبرداریٔ دین کے انوکھے کرشمے اور کہیں لادینیت کے دھماکے، غیر مسلم اقلیتوں کا مسلم لادینیت پسندوں کے پیچھے پاکستان کے استحکام اور ظہورِ اسلام کے "خطرے" کے خلاف صف آرا ہو جانا، گرانیٔ اشیاء، خیانت کاری کے سانپوں اور بچھوؤں کا زور، اس عالم میں تعیش پسندیاں، اسی ماحول میں ذرائع ابلاغ کے اکھاڑوں میں دروغ کا فروغ اور کردار کشی اور رندانہ ثقافت کی عشوہ فروشیاں —— اور دُور سیاچن گلیشیر کی ۲۰ ہزار فٹ بلند چوکیوں پر قلتِ افراد، قلتِ رسد اور قلتِ وسائل کے ساتھ جان کی بازی لگانے والے قابلِ فخر نوجوان جن

---

[1] جس وقت ایک خاص فضا میں یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، اس کے تقریباً ایک مہینہ بعد یہ قارئین تک پہنچیں گی۔ نجانے کتنا پانی راوی اور چناب کے پلوں کے نیچے سے بہہ چکا ہوگا۔ ممکن ہے کہ یہ تحریر محض ایک تاریخی ریکارڈ ہی بن جائے -

کی جنگ کا کوئی اختتام نظر نہیں آتا ـــــ خوشی خوشی سے ایک ایک کر کے شہید ہو رہے ہیں۔

نمازیوں اور شہیدوں کی سعادت اپنی جگہ، مگر باقی تمام احوال کیا اس کا پتہ نہیں دیتے کہ سلطنتِ کائنات کا شہنشاہِ حقیقی ہم سے خوش نہیں ہے۔ اس نے ہم پر بہت بہت کرم کیے، مگر ہم نے اس کے الطاف و احسانات سے بہرہ مند ہو کر اور زیادہ سرکشیاں کیں، ہم نے اپنے اندر جرائم اور گناہوں کو پالا، ہم نے ذرا ذرا سے فائدوں کے لیے کمزوروں کو ظلم کا نشانہ بنایا۔ حرام کمائیوں کو فروغ ہوا، حلال کا دائرہ سکڑتا گیا۔ ہم نے تیز طرار اہلِ دولت وجاہ کی خوشامدیں کیں اور اپنے ہاں کے شریف اور ایمانداروں اور دیانت پسندوں اور پاک نگاہوں کو اپنے انداز تحقیر سے ضربیں لگائیں اور ان کو پیچھے دھکیلا، نیز شرافت کے ظلم کے ساتھ غریبی کے جرم کی سزا بھی دی۔ ہم نے دینِ اسلام کی وحدت و اخوت کو پارہ پارہ اور اس کے اساسی عقیدۂ توحید کی بیخ کنی کے لیے علاقہ پرستی، لسان پرستی، نسل پرستی، صوبہ پرستی اور سیکولرازم اور سوشلزم کے رنگ برنگے جھنڈے اٹھا کر گروہ بخلاف گروہ مار دھاڑ شروع کر دی۔ ہماری تباہی کے لیے جو کام دشمنوں کو کرنا تھا اسے ہم نے رضاکارانہ طور پر خود اپنے ہی ہاتھوں سے بعجلت مکمل کر دینے کے جتن کیے، تاکہ ہمارے دشمنوں کو تکلیف نہ ہو۔

اس وقت راوی کے سیلاب زدہ وسیع علاقے سے قریب ہونے اور ریڈیو اخبارات وغیرہ سے خبریں معلوم کرنے اور سیلاب زدوں کی خدمت کے کاموں پر نکلنے والے بھائیوں سے ربط کی وجہ سے حسبِ ذیل باتیں میرے نوٹس میں آتی ہیں:

۱ـــ مجموعی طور پر ہماری سرکاری مشینری اور ہماری خدمت کیش تنظیموں اور خاص خاص اداروں کے متعلق پول یہ کھلا کہ پوری طرح تباہی واقع ہونے سے پہلے کوئی کچھ نہ کر سکا۔ اور تندیٔ سیلاب کے ابتدائی مرحلے میں بہت ہی کم اور بہت ہی شکست رفتار سے مصیبت زدگان کو امداد دی جا سکی[1]

[1] جو بھی اچھی خدمات ہوئیں مجھے ان کا دلی اعتراف ہے اور خصوصاً فوجی جوانوں کی بے لوث جفاکارانہ خدمات کا بہت احترام کرتا ہوں۔

۲ – امداد دینے والے جونکلنا شروع ہوئے تو اُن سے سوگنا تماشائیوں کے ٹھٹ، کچھ گاڑیوں میں، کچھ پیدل بہ طور پکنک جمع ہو گئے اور رفاہ کاموں میں اتنی رکاوٹ بنے کہ پولیس کو لاٹھی چارج بھی کرنا پڑا۔ مگر لاٹھی چارج سے کیا ہوتا ہے پنجابی مصرعہ ہے:

پُتر نوں کی پند نصیحت، مُورکھ نوں کی پالا ؟

۳ – بات تماشائیوں تک رہتی تو خیر، ساتھ تماش بین بھی موجود! سیلاب زدہ علاقے سے جو لوگ آکر بیٹھتے ان میں کچھ لڑکیاں ہوتیں۔ جہاں کوئی مناسب عمر کی اچھی لڑکیاں نظر آئیں تو لاہور کے مہذب ثقافتی شہر کے گبھرو اُن کی تاک جھانک میں لگ جاتے۔ اور وہ بیچاری جو پہلے ہی کوتاہ لباسی کی ماری ہوئی ہوتیں یوں محسوس کرتیں کہ بُری نظروں نے انہیں بالکل عریاں کر دیا ہے۔

۴ – تماش بینی بھی ایک منزل ہے۔ اس سے آگے کا مقام عظیم ان لوگوں نے حاصل کیا جنہوں نے خالی گھروں (یا ایسے جہاں بے سہارا بچے تھے یا کوئی تنہا بڑھیا) سے مال و متاع لُوٹنا شروع کر دیا اور خدمت کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ بعض صورتوں میں بچیوں اور بچوں ہی کی دولت بیدار کو لے اُڑے۔ بلکہ عورتوں کو بھی۔

میں سوچتا ہوں کہ جس قوم نے ۱۹۴۷ء میں بڑے بڑوں کی دُنیا کو لُٹتے دیکھا ہو، جس نے ۱۹۶۵ء میں بے شمار بستیوں اور گھروں کی تباہی دیکھی ہو، جس نے ۱۹۷۰ء میں بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) میں پاکستانیوں کو شہید اور پھر قیدی بنتے اور مال و جائیداد سے محروم ہوتے دیکھا ہو اور جس قوم کی آنکھوں کے سامنے عبرت کے ٹیلی وژن پر اوجھڑی کیمپ کا سماں دکھا دیا گیا ہو، اس میں انسانوں کو بے وقعت اور مال و املاک کو گراں قدر قرار دینے والے کہاں سے آ گئے۔

تمہارے سامنے موت کا رقص جاری ہے، کثیر التعداد جنازے اُٹھتے ہیں، ہسپتال لاشوں اور زخمیوں سے بھر گئے ہیں۔ گھر گھر سے یا تو چیخیں اور سسکیاں بلند ہو رہی ہیں، یا پتھرائی ہوئی آنکھوں اور بھیانک سناٹے سے سابقہ ہے۔

پھر اگر تمہیں احساس نہیں ہوتا تو کیا تم درندے ہو؟

تم دُنیا کے ان سرابوں اور نظر کے فریبوں پر لٹو ہوتے ہو، جو تمہارے سامنے چھایا بن جاتے ہیں۔

۵ – میخانۂ سیاست کے متوالے جنہوں نے قریب آمدہ انتخابات کے تازہ تازہ جام چڑھائے

ان میں سے اکثر محض اس لیے خدمت کے میدان میں آگئے ہیں کہ ان کا نام چھپ جائے اور کیمپوں کی تصویریں چھپ جانے سے وو ٹوں کی منڈی میں ساکھ بڑھ جائے گی۔ کچھ لوگ جو پہلے سے اس قسم کے کام کرتے رہے ہیں، بلکہ پاکستان کے روزِ اول سے کرتے رہے ہیں۔ ان کا وجود نئے سیاسی خدمت گاروں کے انبوہ کثیر میں گم ہو گیا ہے۔

خدمت جب سیاست کے تابع ہو جائے تو اس کی یہ برکت نہیں ہوتی کہ دلوں میں خدا خوفی اور اس کے بندوں کے لیے سچی محبت و اخوت پیدا ہو۔

۶ ۔ تماشائیوں میں سے ایک خاص عنصر کا یہ کارنامہ بھی ریکارڈ پر رہنا چاہیے (اور اخبارات میں آ چکا ہے) کہ شہر کے مخیر لوگ جو دیگیں پکوا کر سیلاب زدگان کے لیے بھیجتے ہیں، ان میں سے یہ عنصر زور زبردستی اپنا حصہ وصول کرتا ہے۔ پھر جو بچ رہے وہ مصیبت کے ماروں کے لیے۔ گویا یہ لوگ گھنٹوں کا وقت تفریح میں گذارنے کے لیے سیلاب زدگان سے ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ یہ ایک نیا شگوفہ کھلا ہے جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔

۷ ۔ مجھے چند ایسی خواتین کا علم ہے جو خود بتا گئیں کہ جب جہاں سیلاب زدگان کے کھانے پینے کے لیے کچھ بٹتا ہے تو ہماری بستی کے گھروں کے لوگ بھی پہنچ جاتے ہیں۔ وہ برابر کا حصہ وصول کرتے ہیں۔ اب اسی خبر کا پیمانہ ذرا بڑھا کر سوچ لیجیے۔

۸ ۔ خدا اور اس کے دین کو برطرف کر دینے کی وجہ سے ایک عذاب یہ وارد ہوا ہے کہ تفریحی اسکرین اور اسٹیج کے لوگ ۔۔۔ ہیرو اور ہیروئنیں، اداکار اور اداکارائیں، گلوکار اور گلوکارائیں ایکٹنگ کے اطوار کے ساتھ، نگاہوں کے غمزوں کے ساتھ اور جانِ موسیقی بننے والی آوازوں کے ساتھ لشکر در لشکر ٹرک لے کر ایک ایک بازار میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اب سیلاب زدہ علاقے میں بہ نفسِ نفیس مع اپنے شاندار لباسوں اور میک اپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔

یہ بھی ایک نیا تجربہ ہے جو مصیبت کے وقت سامنے آیا ہے۔ دراصل ایک بڑا تغیر جو معاشرے میں پچھلے چند برس میں ذرائع ابلاغ کے ذریعے آیا ہے وہ یہ ہے کہ اس خاص عنصر کو جو بالعموم کنارے رہتا تھا، اُسے اب اُٹھا کر ہمارے سروں پر بٹھا دیا گیا ہے۔ ہر روز ان کی کئی کئی تصاویر کا چھپنا، ان کے مقولوں اور فقروں کو سرخیوں میں ڈھالنا، ان کے انٹرویو لے کر چھاپنا۔ ان کی ذاتی اور گھریلو

زندگی اور اُن کی فن کارانہ صلاحیتوں کے ارتقاء کا ایک ایک پہلو نمایاں کرنا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اِس ملک میں تین ہی طبقے رہ گئے ہیں ـــــ سرمایہ دار و جاگیر دار ـــــ وزراء اور اسمبلی کے ممبران اور ایکٹر اور گلوکار وغیرہ۔

اور دلچسپ یہ رویہ کہ چور کو توال کو ڈانٹنے لگے (مطلب یہ کہ اس طبقے کی سیلابی اداکاری پر دوسروں کے لیے تو ٹوکنا ناروا ہے، البتہ یہ گروہ تنقید کرنے والوں کے منہ آرہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہم رقص و نغمہ والے لوگ غمزدہ عوام میں خوشیاں بانٹ رہے ہیں۔ یہ خوشیاں بانٹنے کا فلسفہ بھی عجیب ہے۔ ایک بادہ فروش بھی یہی کہہ سکتا ہے کہ میں خوشیاں بانٹ رہا ہوں، طوائفیں بھی اس دعوے کے ساتھ نکل کھڑی ہوں گی کہ ہم خوشیاں بانٹنے والا طائفہ ہیں، ہر جوئے خانے میں خوشیاں بٹ رہی ہیں۔ اور انہی خوشیوں کا سیلاب ہے جو معاشرے سے خدا خوفی، خشیت، احساسِ عبدیت اور انسانیت کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کو بہائے لیے جا رہا ہے۔ انبیاء خوشیوں کے چشمے جاری کرنے نہیں آتے رہے۔ وہ ایمان، ہدایت، عبادت، نیکی اور پابندیٔ حدود کا درس دینے کے لیے مبعوث ہوئے۔ یہی راستہ انبیاء کے پیروؤں کا راستہ ہے۔ اور اس راستے پر چلنے والوں کو چاہے بہت آلام و مصائب بھگتنے پڑیں، لیکن انہیں "سکینت" اور فلاح حاصل ہوتی ہے۔ ملّتِ اسلامیہ کی متاعِ مطلوب سکینت و فلاح ہے، جو علامت ہوتی ہے قربِ الٰہی کی اور آخرت میں بخشش کی ۔

جدید ملحدانہ تہذیب کا کمال یہ ہے کہ خوشیوں کے پھولوں کی بارش کرتی رہتی ہے مگر ہر پھول کے نیچے

---

[1] آج کل اخبارات کی خبریں اور تردیدیں عجیب ہوتی ہیں۔ متذکرہ جلسے اس رپورٹ کے تحت لکھے گئے جو جنگ ۴ ر اکتوبر میں "کلچرل رپورٹر" کے حوالے سے شائع ہوگئی، مگر ۴ ر اکتوبر کو فلم انڈسٹری کے نمائندوں کا اپنا اخباری بیان شائع ہوا، جس میں تردید کی گئی کہ ہم نے اس طرح کی باتیں نہیں کہیں اور نہ ایک سیاسی جماعت کی مخالفت کی ہے، نہ ہم شہرت چاہتے ہیں اور نہ ہمیں اخباری بیانوں کی فرصت ہے۔ ہم صرف خدمت کا کام کر رہے ہیں۔ (خلاصہ) مگر کلچرل رپورٹر صاحب نے جو مواد ۳ ر اکتوبر کو لاکھوں افراد تک پہنچا دیا تھا، اس کی وہ خود بھی تردید کرتے۔

اضطراب کے کانٹے اور انجامِ بد کے افعی چھپے ہوتے ہیں۔ اور اس تمدن کے بوکھلائے ہوئے انسان کا حالِ زار دیکھ لیجیے۔ بس اسے یہ فن سکھا دیا گیا ہے کہ جب آنسو بہت بہنے لگیں تو زور سے قہقہہ لگا دے۔

۹۔ عذاب کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ لوگ ذہنی طور پر بہت پراگندہ ہیں، نہ جماعتوں میں حقیقی اجتماعیت ہے، نہ لیڈروں میں کوئی اعلیٰ فکر اور روشن کردار ہے۔ عام افراد بھی ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ جہاں جاؤ دو آدمیوں میں سے ایک کہے گا فلاں شخص بُرا ہے، دوسرا کہے گا وہ تو بہت اچھا ہے۔ کہیں یہ بحث کہ فلاں پارٹی دوستی کے قابل ہے، جواب یہ کہ اس کے کرتوتوں کا ریکارڈ بڑا خراب ہے۔ کسی اخبار کے کالم میں یہ سیاسی نکتہ کہ عبوری دور کی وزارتیں ختم ہو جائیں تو جمہوریت پورا جلوہ دکھائے گی، کسی دوسری جانب یہ رائے کہ وزارتوں کے ختم ہونے سے نظامِ کار میں بڑا خلل واقع ہوگا۔ کسی محفل میں یہ قصہ درپیش کہ بار بار کے مارشل لانے قوم کو خستہ حال کر دیا ہے، مقابل فریق کہتا ہے کہ جمہوریت جب بھی نمودار ہوئی تو قوم پر کوئی بھاری وبال ٹوٹ پڑا۔ زبان کے معاملے میں، تعلیم کے معاملے میں مہنگی فیسوں والے انگلش میڈیم اسکولوں کے متعلق، ٹیکسوں کے متعلق گرانی کے بارے میں، ایڈ اور قرضوں کے موضوع پر، تخریب کاری کے سلسلے میں، جہاد افغانستان کے عنوان کے تحت ــــ اور ہر چیز کے متعلق جا بجا بحثیں ہیں، بحثوں سے بڑھ کر سر پھٹول ہے، سر پھٹول سے آگے نکل کر کلاشنکوفوں کی آتش باری ہے۔ کوئی کسی کی دلیل نہیں سنتا، کوئی کسی سے معقول بات قبول نہیں کرتا۔ کوئی کسی کے ساتھ اختلاف کرتے ہوئے خندہ پیشانی اختیار نہیں کر سکتا۔ ہر شخص اور ہر گروہ اور ہر فرقہ اور ہر عالم اور ہر لیڈر اور ہر ایڈیٹر اپنی اپنی جگہ قطب صاحب کی لاٹھ ہے کہ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ کوئی سوال ہی اٹھتا نہیں کہ علم و عمل کی کمی کے ساتھ انا کے قامت کا کیا تناسب ہے؟ کوئی قابلِ غور بات یہ نہیں کہ کوئی صاحب کس بنا پر کتنی اتھارٹی کے ساتھ کس کے سامنے پہلوان بنے للکار رہے ہیں؟ پورا معاشرہ ایک دنگل ہے، جس میں خیالات، عقیدے، رائیں چاروں طرف سے اُمڈ اُمڈ کر ٹکرا رہی ہیں۔ اور ہر شخص اس خیال میں ہے کہ سارا خلوص اور ساری صداقت اس کے نام الاٹ ہو گئی ہے اور اس کا کام دوسروں سے اپنی بات منوانا اور ٹھونسنا ہے، کسی سے سمجھنے کا کوئی معاملہ نہیں۔

اس صورتِ حالات نے آپس کی محبتیں فنا کر دی ہیں۔ اعتماد کے رشتے توڑ ڈالے ہیں، ہم دمی، ہم قدمی اور ہم منزلی کے جذبے ملیا میٹ کر دیئے ہیں۔ کسی آدمی کے سامنے آتے ہی ایک خوف و اندیشہ

مسلط ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی نہ جانے کس بحث کا چھرا ڈب سے نکال لے گا۔ اب تو خدا کی باتیں، نیکی کی باتیں اور خدمتِ انسانیت کی باتیں کرتے ہوئے ڈر آتا ہے کہ آیا متکلم اپنی عزت کو سنبھال سکے گا یا نہیں۔

کتنا بڑا عذاب ہے جس سے ہمارا کوئی متنفس محفوظ نہیں۔

۱۰۔ پھر غالب بحثیں اور مکالمے، دنیوی معاملات اور سیاست اور اسمبلیوں اور پارٹیوں اور حکومت اور لیڈروں کے متعلق، سندھ اور پنجاب کے متعلق، بہاریوں اور کالا باغ ڈیم کے متعلق، ایم کیو ایم اور پٹھانوں کے متعلق، آمدنیوں اور اخراجات کے متعلق، تقریبوں اور تفریحوں کے متعلق، پلاٹوں اور عمارتوں کے متعلق ہوتے ہیں۔ اِس سطح سے اُوپر کی چیزوں کو ہم بصول بھلا بیٹھے ہیں۔

مجھ سے بہت سے افراد کی ملاقاتیں اور "آدھی ملاقاتیں" ہوتی ہیں۔ مجھے صدمہ ہے کہ چند سال سے بہت کم ایسا ہوا کہ کوئی صاحب، دین کی کوئی اُصولی بات، قرآن کی کوئی آیت، حدیث کا کوئی مسئلہ سامنے لائے ہوں۔ بہت سی مجلسوں کو ان چیزوں سے خالی پایا۔ بہت سے جلسوں اور تقریروں میں یہ پاکیزہ عنصر نہ تھا۔ ان کے سوا بہت باتیں —— باتیں ہی باتیں۔

ہم لوگوں نے پچھلے دس پندرہ سال میں ملک میں پھیلے ہوئے عوام کے پاس جا جا کر اور ملاقاتیں کر کر کے، چھ چھ ماہ صرف کر کے خدا کی باتیں اس طرح نہیں پہنچائیں کہ اُن کے دلوں میں چراغ روشن ہو جاتے۔ آج حال یہ ہے کہ باہر کے لوگ تو الگ رہے، سیلاب کی زد میں آنے والے اور کلاشنکوفوں کا ہدف بننے والے اور عبرت کے اُن مناظر کو دیکھ کر بچنے والے اکثر لوگ خدا خوفی، توبہ و استغفار، اِنابت و عبادت، ذکر و دُعا کی حیات افروز اور اُمید افزا نورانیتوں سے دُور ہیں جس خدا کے ہاتھ میں حوادث کی ساری باگیں ہیں، اُس کی طرف توجہ کرنے والے بہت کم ہیں۔

اپنی جگہ یہ تباہی اور یہ مصیبت زیادہ بڑی ہے۔ بمقابلہ سیلاب اور کلاشنکوفوں کے! اور اس کے چھا جانے کا باعث ہماری اور تمام دینی جماعتوں کی یہ کوتاہی ہے کہ انہوں نے بچے بچے تک بار بار پیار اور محبت سے خدا کا پیغام پہنچانے کی پوری کوشش نہیں کی۔ خصوصاً شو بزنس کے بڑھنے کا یہ دور، ٹیلی وژن اور وی سی آر کا یہ دور، ثقافت کی پریوں کے رقص و سرود کا یہ دور، معیارِ زندگی کو بڑھانے کے لیے دولت کی سڑک پر دنیا پرستی کی مجنونانہ مسابقت (RACE) کا یہ دور، شریعت دشمنی

اور لادینیت پسندی کا یہ دور، سُرخ و سفید سامراج کی طرف سے اسلامی عقاید و اقدار کی تباہی مچانے کا یہ دور ہے۔ اس میں جس زور و شور سے ملّت کے ایک ایک فرد اور آسمانِ پاکستان کے ایک ایک ستارے تک پہنچنے اور اس کو گلے سے لگا لینے اور اس کے سینے میں نورِ محمدیؐ کی شعاعیں اُتار دینے اور ان شعاعوں سے دل و دماغ کے چراغ روشن کر دینے کی ضرورت تھی، افسوس کہ جن کی یہ ذمہ داری تھی وہ اسے پورا نہ کر سکے۔

کیا اب چند سال کی سرتوڑ محنت سے اس کوتاہی کی تلافی کرنے پر ہم اور دوسرے محبانِ دین تیار ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہو تو ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارے اجتماعی وجود کا انجام کیا ہو گا۔ لیکن اگر جواب اثبات میں ہو تو بڑے سے بڑے بگاڑ کو خیر و فلاح سے بدلا جا سکتا ہے۔

سیلاب سے متعلق ایک مسئلہ خصوصی طور پر قابلِ غور ہے۔

ہمارے دریاؤں کا پانی بھارت نے خرید کر جب اُن پر ڈیم بنا لیے اور ان کا بہاؤ اپنی زمینوں کو زرخیز بنانے کے لیے تبدیل کر لیا تو اب اُسے اس اُصولِ انصاف کو تسلیم کرنا چاہیے کہ جو جس چیز سے فائدہ اُٹھائے، اس کا نقصان بھی وہی برداشت کرے۔ اگر یہ نقصان پاکستان کی سرزمین اور آبادی اور دولت و وسائل کو پہنچے تو اس کا تاوان اُسے ادا کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں اس بار تو بھارت کی طرف سے پانی کی آمد، اس کے وقت اور اس کی مقدار کی بھی کوئی مکمل اطلاع نہیں دی گئی۔ ازیں صورت اس کی ذمہ داری اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔

لیکن بنیادی طور پر تو ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ وہ سیلاب کا پانی جمع ہو جانے پر ہماری جانب کا کوئی بند نہ توڑے بلکہ اپنی ہی سرزمین پر اس کے بہاؤ کا انتظام کرے۔ اگر اُدھر سے کوئی کوتاہی ہو تو راوی اور ستلج پر ایسے پشتے اور بند تعمیر کیے جائیں جو پانی کو پاکستان میں داخل ہونے سے روکیں۔ اس کا بہاؤ بھارت کی طرف موڑ دیں۔ کسی معاہداتی طریق سے بات طے ہو سکے، یا اقوامِ متحدہ میں بحث اُٹھا کر کامیابی حاصل کی جا سکے۔ یا پھر عالمی عدالت میں یہ قضیہ حل کرایا جائے۔

اگر یہ مسئلہ حل نہ ہو تو خطرے کی یہ تلوار ہمارے سروں پہ لٹکتی رہے گی کہ بھارت کسی بھی موقع جارحیت پر دریاؤں کے بند اوپر سے کھول دے یا توڑ دے اور آدھا پنجاب (خصوصاً وسطی حصہ) زیرِ آب آ جائے، تباہی اور معاشرے کی پریشانی اپنی جگہ، نقل و حرکت کرنا بھی ممکن نہ ہو، کہیں کیمپ نہ لگائے جا سکیں، مورچے نہ بن سکیں، بجلی سے وسیع علاقہ محروم ہو جائے، پھر آخر دفاع کی ذمہ داریاں کیسے پوری کی جا سکیں گی۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اُدھر سے اچانک جارحانہ یلغار شروع ہو اور ادھر عین اس وقت جب کہ ہمارے عساکر سفر کر رہے ہوں اور توپیں وغیرہ جگہ جگہ نصب ہوں، یکایک پانی کا لشکر بھی بھیج دیا جائے۔ اس صورت میں کیا حل ہے؟

میرا خیال ہے کہ اعلیٰ ترین ذمہ داروں کو اس مسئلہ کے متعلق "فول پروف" حد تک اطمینان بخش حل نکالنا اور عمل میں لانا چاہیے۔